اقبال اور نفاذِ شریعت

(جناب جسٹس جاوید اقبال کے بعض افکار پر ایک نظر)

جناب محمد امین صاحب

۲۲ر اپریل ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں یومِ اقبال کے موقع پر فرزندِ اقبال جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی جو تقریر رپورٹ ہوئی ہے، اس کے مطابق انہوں نے کہا "عبادات اور معاملات قطعی طور پر دو الگ الگ چیزیں ہیں، حکیم الامت نے معاملات میں اجتہاد کی تلقین کی ہے عبادات میں نہیں" ___ یہی بات انہوں نے ذرا وضاحت سے یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ایک تقریب میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہی تھی جب انہوں نے فرمایا "عبادات اور معاملات میں نمایاں فرق ہے۔ اور ان قرآنی احکام میں تبدیلی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، جن کا تعلق زیادہ تر عبادات سے ہو۔ تاہم جن احکام کا تعلق معاملات سے ہو، ان میں وقت کی ضرورت کے مطابق نئی تعبیریں کی جا سکتی ہیں" ___ اسی طرح ۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں جناب صدر ضیاء الحق کا وہ بیان بھی اخبارات میں چھپا ہے جس میں انہوں نے سپریم کورٹ کے جسٹس جاوید اقبال کے اس موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ "ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزا جابرانہ ہے لہٰذا اس قسم کے قوانین ختم کر دیئے جائیں" یہ یقین دلایا ہے کہ قرآنی سزاؤں کو ختم نہیں کیا جائے گا۔ ازیں پیشتر ہمیں وہ بیان بھی دیکھنے کا موقع ملا تھا جس میں سرگودھا بار سے خطاب کرتے ہوئے جناب جاوید اقبال نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اجتہاد کے لیے عربی زبان جاننے کی شرط ختم ہونی چاہیے اور وکلاء کو حقِ اجتہاد ملنا چاہیے۔

اگر یہ آرا کسی کمیونسٹ دانشور، سیکولر سوچ رکھنے والے کسی بیوروکریٹ یا کسی سوشلسٹ سیاسی لیڈر کی ہوتیں تو ہم خاموش رہتے، لیکن چونکہ یہ آرا حکیم الاُمت اور مفکرِ اسلام و پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزندِ ارجمند حضرتِ جاوید اقبال کی ہیں، جو اقبالؒ کے مادی ہی نہیں ان کی معنوی فکر کے وارث بھی ہیں، جو پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے جج ہی نہیں، پی ایچ ڈی بھی ہیں۔ اور غالباً ان کی نسبت کی رفعت اور منصب کی بلندی ہی کا اثر ہے کہ لوگ اُن کی آرا جاننے کے باوجود احتراماً خاموش رہے ہیں۔ ورنہ کوئی اور آدمی ہوتا تو اُس کا وہی حشر ہو سکتا تھا جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا ہوا۔

خود ہمیں بھی جناب جاوید اقبال کی تکریم ہر لحاظ سے اور ہر درجہ میں محبوب ہے لیکن اگر احساس یہ ہو کہ ان کا موقف شریعتِ مطہرہ کے موقف سے ٹکرا رہا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا و رسولؐ کی عزت ساری عزتوں سے اور ان کی محبت ساری محبتوں سے بڑھ کر ہمیں بھی عزیز ہے اور ہر مسلمان کو بھی عزیز ہونی چاہیے، چنانچہ قصہ درد سُناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم۔ اور جناب جاوید اقبال سے پیشگی معذرت کہ مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

فقہ اسلامی کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے سے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی سے متعلق جناب جاوید اقبال کی مذکورہ آرا، میں کوئی وزن نہیں۔ ان کے دلائل اتنے کمزور ہیں کہ ان پر بحث کرنے میں کوئی لطف نہیں، وہ اتنے پُرانے ہیں کہ ان کا جواب دینے میں کوئی جدت نہیں، تاہم چونکہ یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں جس کا اسلامی، علمی اور قانونی حلقوں میں ایک مقام ہے لہٰذا یہ چند سطور حاضر خدمت ہیں۔

فکرِ اقبال کے حوالے سے جناب جسٹس جاوید اقبال کا موقف یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ قرآن کے وہ احکام جو معاملات سے متعلق ہیں سب قابلِ تغیر ہیں اور ان میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جناب کے اس موقف کی سند اور ماخذ کیا ہے؟ جس آدمی نے بھی اسلامی شریعت اور فقہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ معاملات میں خدا اور رسولؐ کے احکام دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کی تفصیلات قرآن و سنت میں آگئی ہیں اور یہ عام طور پر ایسے احکام ہیں، جو سوسائٹی کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے انتہائی ضروری

ہیں۔ مثلاً حفظِ نسل (زنا)، حفظِ مال و امن (چوری، ڈکیتی)، حفظِ عقل (شراب نوشی وغیرہ) اور حفظِ عزت و ناموس (قذف) وغیرہ۔ ان کے بغیر انسانی معاشرہ صالح بنیادوں پر کھڑا ہو ہی نہیں سکتا، یا پھر معاملات کے وہ پہلو جن کی تفصیلات کا صحیح صحیح تعین کرنا انسانی بس میں نہیں مثلاً نکاح و طلاق اور وراثت کے اُمور۔ اس کے علاوہ معاملات میں شارع کا عمومی اسلوب یہی ہے کہ وہ بنیادی اُصول و قواعد بیان کر دینے پر اکتفا کرتا ہے اور یہ بات مسلمانوں کے اصحابِ اجتہاد پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہر معاشرے میں اپنے ماحول کی ضروریات کے مطابق اس کی تفصیلات شریعت کے بنیادی احکام اور اس کے مقاصد و مزاج کی روشنی میں طے کرلیں۔ اسی طرح شریعت کا ہر سنجیدہ طالب علم یہ بھی جانتا ہے کہ اجتہاد کا دائرۂ کار کیا ہے؟ اجتہاد کا دائرۂ کار یہ ہے ہی نہیں کہ وہ قرآن و سنت میں بیان کردہ احکام کو تبدیل کرے۔ منصوص احکام میں اجتہاد کی گنجائش صرف اتنی ہے کہ اگر نص کے الفاظ ایک سے زیادہ معنی و مفہوم کے محتمل ہوں تو ان میں سے راجح تر کا تعین کیا جائے یا ان احکام کی تطبیق کے لیے جن تفصیلی احکام اور پروسیجرل ضوابط کی ضرورت ہو تو ان کو بنا لیا جائے، ورنہ کوئی مسلمان یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ خدا اور رسولؐ کے احکام کو بدل سکتا ہے۔ غیر منصوص احکام میں اجتہاد کی گنجائش یہ ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص پر قیاس کرتے ہوئے اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں، نیز مسلمانوں کے مفاد و مصالح کی خاطر اور استنباط و استخراج کے ان طریقوں پر عمل کرتے ہوئے جن کی اجازت قرآن و سنت سے ملتی نظر آتی ہے، اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔

ہم آنجناب کی توجہ دو ایسے قانونی قاعدوں کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں جو اسلامی اُصولِ فقہ ہی کے نہیں موجودہ اُصولِ قوانین کے نزدیک بھی معتبر بلکہ متداول ہیں۔ ان میں سے پہلا قاعدہ تو یہ ہے کہ کسی اتھارٹی کے وضع کردہ قانون کو صرف وہی اتھارٹی خود یا اس سے بالاتر اتھارٹی ہی ختم کرسکتی ہے۔ جیسے پاکستان میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو کوئی صوبائی اسمبلی ختم نہیں کرسکتی، یا سپریم کورٹ کے کسی فیصلے کو کوئی سیشن عدالت ختم نہیں کرسکتی۔ اسی طرح قرآن کے کسی فیصلے کو قرآن ہی منسوخ کرسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فیصلے کو خود تو بدل سکتے ہیں لیکن کسی اُمتی کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ ان کو بدل سکے۔ بدلنا

تو ایک طرف رہا، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم ان کے فیصلے کو تہہ دل سے برضا و رغبت تسلیم نہیں کرو گے تو تم سرے سے مومن ہی نہیں ہو۔ (النساء - ۶۵)

دوسری بات یہ کہ جسٹس صاحب غالباً جس چیز پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ قانون کو جامد نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس میں اتنی لچک ہونی چاہیے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ ان کی یہ خواہش بالکل بجا ہے لیکن سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اسلام کے نظامِ قانون میں یہ خوبی موجود ہے یا نہیں! جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا کہ معاملات کی حد تک اسلام میں ناقابلِ تغیر قانونی احکام صرف وہ ہیں جو سوسائٹی کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ یا پھر ان تفصیلات تک محدود ہیں جن کا تعین کرنا عقلِ انسانی کے بس میں نہیں، جیسے شخصی قوانین وغیرہ۔ ورنہ زندگی کے دیگر سارے معاملات میں اجتہاد کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اور یہ شارع نے عمداً اسی حکمت کے پیش نظر چھوڑی ہے کہ مسلمانوں کو تنگی محسوس نہ ہو اور وہ بدلے ہوئے حالات میں اجتہاد کر سکیں یا پہلے کے بنائے ہوئے اجتہادی قوانین میں تبدیلی کر سکیں۔ قرآن و سنت کی نصوص میں اجتہاد کی گنجائش ان کی تطبیق اور تعبیر میں ہے، ان کے تغیر و تبدل میں نہیں۔ حضرت عمرؓ کی مثالیں بعض لوگ اس غلط فہمی میں دیتے ہیں کہ گویا حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں قطعِ ید کی سزا ختم کر دی تھی یا مؤلفۃ القلوب کی مد ختم کر دی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل ہی غلط ہے، اگر ان واقعات کی غیر جانب دارانہ علمی تحقیق کی جائے (جو بہت سے لوگوں نے پہلے کی ہے)، تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآنی احکام کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ خود قرآن و سنت میں ان احکام کے الفاظ و معانی میں اس مفہوم کی گنجائش موجود تھی جس کو انھوں نے اختیار کیا تھا ـــــ اس کے باوجود اگر جسٹس صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کے اندر کوئی مستقل بالذات قدر ہونی ہی نہیں چاہیے۔ اور قانون سارے کا سارا ہمیشہ ہی قابلِ تغیر ہونا چاہیے تو ہم ان کی توجہ ان مغربی اقوام کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے، جہاں اس طرح کی مستقل اقدار نہیں ہیں اور قانون وہاں بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے، خود امریکہ جیسے ممالک میں پہلے شراب کی اجازت تھی۔ پھر پابندی لگائی گئی، پھر یہ پابندی ہٹا دی گئی، لواطت اکثر مغربی ممالک میں غیر قانونی ہے جب کہ بعض ملک اسے قانونی قرار دے چکے ہیں، بعض ملکوں

میں موت کی سزا دی جا سکتی ہے بعض میں نہیں۔ ہماری رائے میں مستقل قانونی اقدار کا وجود عقلی لحاظ سے بھی ہمارے نظامِ قانون کی ایک خوبی ہے نقص نہیں، اس سے قطع نظر ان پر ایمان لانا اور عمل کرنا ہمارے ایمان کا حصّہ بھی ہے۔

۲۔ جسٹس صاحب کا ایک موقف یہ بھی ہے کہ حدیں نافذ کرنے والا قانون جابرانہ ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔ اس کا ایک جواب تو اُوپر آ چکا کہ ہمیں قانوناً اس چیز کا حق نہیں ہے کہ ایک بالاتر اتھارٹی کا وضع کردہ قانون ختم کر سکیں اور دوسرے ہمارے ایمان اور اسلامی حمیت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ہم خدا کے احکام پر عمل درآمد کریں نہ کہ انہیں اس لئے بدلنے کی کوشش کریں کہ اس پر بعض غیر مسلموں کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ آخر خدا نے اپنی کتاب صرف اس لیے تو نہیں بھیجی کہ ہم اُسے جزدانوں میں سجا کر رکھیں یا اس سے دَم درُود کا کام لیں اور ایصالِ ثواب کریں بلکہ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے، زندگی گزارنے کا لائحہ عمل ہے — اور یہ اسلامی حمیت والی بات اتنی بے وزن بھی نہیں کیوں کہ اس سے پہلے یہ روایت قائم ہو چکی ہے کہ پاکستان کے ایک غیر مسلم چیف جسٹس ایک مغربی مُلک میں دُنیا بھر کے ماہرینِ قانون کی ایک کانفرنس میں اسلامی حدود کے نفاذ کی حمایت کر چکے ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ چلیئے اس بات کو میرٹ کی بنیاد پر لیں، ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے بہت سے ممالک میں خصوصاً سوشلسٹ بلاک میں سخت ترین سزائیں نافذ ہیں، لیکن یہ اقوام اپنے قوانین پر عمل کرتے ہوئے خجالت محسوس نہیں کرتیں اور نہ انہیں جابرانہ قرار دے کر منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ پھر ہمیں ہی اپنے حدود قوانین پر شرم کیوں آئے ؟

اب آیئے میرٹ کی ایک اور بنیاد کی طرف۔ دنیا میں اس وقت جرائم کی شرح جس ملک میں سب سے کم ہے وہ سعودی عرب ہے جہاں حدُود نافذ ہیں اور دُنیا میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ امریکہ اور یورپ میں ہے۔ جو ہمارے ہاں مغرب سے متاثر ذہنوں کا قبلہ وکعبہ ہے درا صل جو بات ہمارے بعض دانشوروں کے پلّے نہیں پڑتی۔ وہ یہ ہے کہ مغرب کا وہ بنیادی فلسفہ ہی غلط ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس فرد (یعنی مجرم) سے تو نرمی برتو جو ظلم و تجاوز کرتا ہے لیکن اس سوسائٹی سے انصاف نہ کرو جس کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام

کا فلسفہ یہ ہے کہ پہلے تو ایسا ماحول پیدا کرو جہاں جرم تک کی نوبت ہی نہ پہنچے اور اگر اس کے باوجود کوئی شریر النفس ظلم و تجاوز کرے تو مجرم کو سخت سزا دو تاکہ اُسے بھی غلطی کا احساس ہو اور دوسرے بھی عبرت پکڑیں تاکہ انسانی معاشرہ مجرموں کی زرخیز پناہ گاہ نہ بن جائے۔

۳۔ جناب جسٹس صاحب کا ایک موقف یہ ہے کہ مولوی تو اجتہاد کے اہل نہیں، قانون کی پریکٹس تو کرتے ہیں وکلا، اور ان میں سے خاصے ایسے لوگ ہیں جو ذہین و فطین ہیں۔ اور معاشرے کی قانونی ضروریات کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اجتہاد کا حق انہیں ملنا چاہیے لیکن اس میں دقت یہ سامنے آتی ہے کہ اجتہاد کے لیے قرآن و سنت کے گہرے علم کی ضرورت ہے اور اکثر اسلامی لٹریچر عربی زبان میں ہے۔ وکلا اور جج حضرات کی اکثریت کو عربی آتی نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مصادر سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کا حل جسٹس موصوف یہ تجویز فرماتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے عربی کی شرط اُڑا دی جائے کیونکہ قرآن و سنت اور فقہ کو سمجھنے کا دعویٰ تو اُردو انگریزی تراجم سے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عربی سیکھنا تو ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اجتہاد کے سلسلے میں ملّا و مولوی کی کمزوریاں اپنی جگہ (اگرچہ سارے علماء انگریزی زبان اور عصری ضروریات سے اتنے بے خبر بھی نہیں بلکہ اب تو ایسے آدمی بھی الحمد للہ ہمارے ہاں موجود ہیں جو جدید قانون اور اسلامی فقہ دونوں پر اچھی نظر رکھتے ہیں، اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہی سہی)۔ لیکن اس کا حل جو جسٹس صاحب نے تجویز فرمایا ہے وہ بہت خوب ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ مطالبہ کیا جائے کہ جو شخص برٹش کامن لاء میں پی ایچ ڈی کرنا چاہے اس پر سے یہ شرط ختم کر دی جائے کہ اُسے انگریزی زبان بھی آتی ہو۔ یا یہ مطالبہ کیا جائے کہ ڈاکٹروں پر سے یہ پابندی اُٹھا لی جائے کہ وہ ایم بی بی ایس بھی پاس ہوں۔ یا بدرجہ آخر یہ مطالبہ ہو کہ ایک آدمی کو علاج کروانے کے لیے ایک انجینئر کے پاس جانے اور اپنا مکان بنوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

جو بات ہمارے قابلِ احترام جج صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب کے سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا حق کسی خاص طبقے یا نسل یا جنس میں محصور نہیں ہے بلکہ اجتہاد کا حق

ہر اس مسلمان کو حاصل ہے جو صاحب علم ہو اور اس علم کے حصول پر کوئی پہرہ تو نہیں، کوئی پابندی تو نہیں جو بھی چاہے اپنی محنت و کوشش سے یہ وصف حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ملّا کو بُرا بھلا کہا جائے یا وکلاء و جج صاحبان کو حق اجتہاد دلوانے کے لیے عربی کی شرط ختم کرنے کی تجویز رکھی جائے۔ یہ بات زیادہ منطقی اور قابل فہم ہے کہ وکلا پر عربی اور فقہ اسلامی پڑھنے کی شرط عاید کر دی جائے۔ جسٹس صاحب حکومتی اور قانونی حلقوں میں بارسوخ ہیں۔ اگر وہ متعلقہ انتظامی حلقوں کو قانون کے طالب علموں اور پریکٹس کرنے والے وکلاء اور ججوں کے لیے عربی اور اسلامی فقہ کی تدریس و تربیت کی اہمیت کا احساس دلوا سکیں تو یہ ایک بہت بڑا کار خیر ہوگا اور اس اعلیٰ و ارفع نسبت سے مناسبت بھی رکھے گا جس کے وہ حامل ہیں۔

اس بات پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جسٹس صاحب اور بنچ اور بار میں ان کے دوسرے ساتھیوں کے ایسے ہی خیالات کا پس منظر کیا ہے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک آدمی نے اپنی عمر کا بہترین وقت اور کثیر سرمایہ لگا کر ایک علم حاصل کیا، اس کی پریکٹس کی، پھر محنت و کوشش کے بعد اس میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اب اچانک ماحول میں ایک تبدیلی آتی ہے اور ایک آدمی اٹھ کر کہتا ہے کہ یہ وکلا اور جج حضرات تو عربی اور اسلامی فقہ میں ماہر نہیں لہٰذا یہ اس کام کے اہل نہیں۔ دوسری طرف عربی اور اسلامی فقہ کی شدھ بدھ عموماً ان لوگوں کو ہے جو ملّا اور مولوی ہیں۔ اور جن کا معاشرے میں کوئی اونچا مقام نہیں۔ ان حالات میں ردِ عمل کا ہونا ایک فطری بات ہے، یہ ہزاروں پڑھے لکھے معزز لوگوں کے کیریئر اور روزگار کا مسئلہ ہے۔ اسی لیے انفرادی مخالفت کے علاوہ بعض وکلا تنظیموں نے قاضی عدالتوں کے خلاف باقاعدہ قرارداد یں پاس کی ہیں اور اب حکومتی اور غیر حکومتی حلقوں میں اسی تاثر کے تحت بعض دینی سیاسی جماعتوں کے پیش کردہ شریعت بل کی مخالفت بھی جاری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر تدبر اور تحمل سے کام لیا جائے تو اس مسئلے کو ہزاروں معزز لوگوں کے کیریئر اور روزگار کا مسئلہ بنائے بغیر بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ ملک کا عدالتی ڈھانچہ آخر بٹن دبانے سے تو اسلامی نہیں ہو جائے گا۔ اور نہ اس کے لیے ضروری تیاری کیے بغیر

کوئی دیرپا اور مفید کام کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا موجودہ ماہرینِ قانون کی ضرورت ہمیں کافی عرصے تک رہے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جج اور بار میں ہمارے قابلِ احترام بھائیوں کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ بظاہر ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ مستقبل قریب میں پاکستان میں ایسی حکومت قائم ہوجائے گی جو پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ ملک کے ڈھانچے کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے میں زور دکھائے گی تاہم اگر ایسی صورت ہو تو بھی ہم پیشۂ قانون سے وابستہ ان معزز حضرات کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری سمجھیں گے کہ حقیقی اسلامی عدل کے نفاذ میں انہیں کوئی قربانی دینی بھی پڑے تو اچھا مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں قربانی سے گریز نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ احکامِ الٰہی کے مطابق فیصلے نہ ہونا اور نہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں صاف صاف فرمایا ہے کہ" جو لوگ میرے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ ظالم ہیں..... وہ فاسق ہیں..... وہ کافر ہیں" صاحبِ ایمان ہی نہیں اور صاف ظاہر ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی گیا گزرا ہو (خواہ جج اور وکیل ہی کیوں نہ ہو) ایمان کی قیمت پر بہر حال کوئی مفاد حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک اور اہم بات جس کا ادراک حاملینِ فکرِ اقبال کو کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ اقبال ایک غلام ملک کا فرد تھا۔ وہ اسلام کے غلبے کی آرزو ہی کرسکتا تھا اور وہ اس نے کی بلکہ اس کی عظمت یہ ہے کہ اس نے یہ آرزو دوسروں میں بھی پیدا کی لیکن چونکہ اسلام کے عملی نفاذ کے لیے کوئی حقیقی پلیٹ فارم اس کے سامنے موجود نہ تھا، اس لیے اس کی آرزو کا رومانوی ہونا بالکل سمجھ میں آتا ہے، عملی زندگی کی مشکلات کسی فکر و فلسفے کے رومانوی تصور سے الگ چیز ہوتی ہے مثلاً اقبال انتخابات کا حامی تھا، ہم بھی اس کے حامی ہیں لیکن کیا پاکستان میں مروجہ انتخابات کے عمل سے حقیقی رائے عامہ کے حامل نمائندہ لوگ اوپر آسکے ہیں؟ اس کا جواب ہاں میں دینا مشکل ہے، اقبال منتخب اور بالاتر پارلیمنٹ کا حامی تھا اور اسے حقِ اجتہاد دینا چاہتا تھا، ہم بھی اس کے حامی ہیں۔ لیکن کیا ہماری پارلیمنٹ کے ارکان قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح اور اجتہاد کے اہل ہیں؟ ظاہر ہے

(باقی برصفحہ ۲۹)